نظامِ اسلامی اور اطاعتِ رسولؐ

(حدیث کا مقام نظامِ شریعت میں)

(نعیم صدیقی)

(۵)

رسالت کی مزید اہم ذمّہ داریاں دعوتِ حق کو نہ ماننے والوں کے لیے رسولؐ کی ذمہ داری اگر بلاغ پر ختم ہو جاتی ہے تو ماننے والوں کے معاملے میں گوناگوں ذمہ داریاں اس کے اوپر عاید ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے تبیینِ کتاب نہایت درجہ اہم مرکزی ذمّہ داری ہے لیکن محض تبیینِ کتاب پر اُس کا کام ختم نہیں ہوتا، بلکہ جوں جوں کتاب کا منشا وہ واضح کرتا جاتا ہے تو اس سے جہاں مومنین کے لیے فرائض اور ذمہ داریاں نمودار ہوتی ہیں۔ خود رسولؐ کے لیے بھی فرائض اور ذمہ داریوں کا ایک سلسلہ چل نکلتا ہے۔ ان میں سے ہم چند نمایاں چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں :-

تنظیمِ جماعت

اسلام ایک اجتماعی دین ہے۔ یہ محض افراد کی اصلاح نہیں کرتا، اصلاح پذیر افراد کو جوڑ کر ایک صالح تنظیم بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ اپنی عین فطرت کے تقاضے سے جماعتی زندگی چاہتا ہے۔ جب کبھی بھی کوئی رسول یا نبی آیا ہے اور اُس نے دعوتِ حق دی ہے تو یہ لازم رہا ہے کہ وہ ایمان لانے والوں کو اپنے گرد سمیٹے اور ایک رشتۂ اخوت میں اُن کو پرو دے، وہ ذرّوں کو جوڑ کر ایک نئی دنیا تعمیر کرے اور قطروں کو ملا کر ایک سیلِ بے پایاں بنائے۔ بلکہ مطالبہ "اطیعون" کا اصل مفہوم ہی یہی ہے کہ خدا کے مامور کردہ داعیٔ حق کو اہلِ ایمان اپنا لیڈر تسلیم کریں اور اپنی ساری قوتیں اُس کے اختیار (DISPOSAL) پر چھوڑ دیں۔ وہ اپنے آپ کو اس طرح رسول کے حوالے کر دیں جس طرح

تو دۂ گِل کسی کلگر کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ اسے چاک پر رکھ کر اپنے تخلیقی آرٹ کے سانچے میں ڈھالتا جاتا ہے اور کچھ مطلوبہ اشکال دے کہ وہی تودۂ گل چاک سے اُترتا ہے تو کچھ کا کچھ بن چکا ہوتا ہے۔ اس میں ایک ایسی مقصدیت و افادیت آجاتی ہے جو پہلے نہ تھی۔ اس تودۂ گل کے ذروں میں پہلے کوئی مقصدی جوڑ نہ تھا، لیکن اب مقصدیت نے جب اسے کچھ اشکال دے دیں تو اب ہر ذرہ دوسروں کے ساتھ مل کر مقصدیت کو پورا کرنے والا بن گیا اور ہر ذرّے میں ایک نئی قدر و قیمت آگئی۔ بلکہ ان ذرّوں سے جو مختلف پیکر تیار ہوئے تو وہ انفرادیت رکھنے کے باوجود مقصدیت کے تحت باہم دگر ہم آہنگ ہوگئے۔ مثلاً ایک گھڑا، ایک چینی، ایک پیالہ، اگرچہ اپنے اپنے وجود، اپنی اپنی اشکال، اپنے اپنے سائز اور اپنے اپنے ڈیزائن کے لحاظ سے بالکل جدا جدا ہیں لیکن وہ سب ایک ہی مدعا سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اسی طرح رسول کا بنیادی فرض ہے کہ وہ افراد کو اپنے چاک پر رکھ کر مقصدیت کے مطابق ایک خاص فکری و کرداری ہیئت دے اور ان سب کو ایک ہی مدعا کے لیے باہم دگر ہم آہنگ کر دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (گذشتہ تمام انبیاء کی طرح) اس لیے نہیں بھیجا گیا تھا کہ آپ کچھ وعظ گوئی کر کے اور کچھ عقیدوں کی توضیح کر کے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں بلکہ آپ کو مامور اس پر کیا گیا تھا کہ آپ اپنی پیش کردہ فکر کا وسیع سے وسیع پیمانے پر اجتماعی مظاہرہ کر کے میدان سے ہٹیں۔ یہ چیز تنظیم جماعت کا مطالبہ کرتی تھی۔ اور جماعت کی تنظیم آپ نے اوّل روز سے فرمائی جماعتی تنظیم کا آغاز مکہ ہی میں ہو گیا تھا۔ اس کے پہلے رکن (اول المومنین) خود آنحضور صلعم تھے۔ پھر جو حضرات سب سے پہلے آپ پر ایمان لائے ـــــ حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت علیؓ، حضرت خدیجہؓ، حضرت زیدؓ ـــــ سب کے سب آپ کے واسطے سے خدا پر ایمان لائے۔ ان میں سے ہر ایک نے آپ کے روبرو وہ عہد استوار کیا جس سے آدمی ایمان و اسلام کے دائرے میں داخل ہوتا ہے۔ اور یہی صورت بعد میں تسلسل سے قائم رہی۔ خدا اور خدا کے دین پر اس طرح کے انفرادی اور آزادانہ ایمان لانے کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں نے خدا کو خدا مان لیا ہو، اپنی اصلاح کسی نقشے پہ

خود ہی شروع کردی ہو، اور اپنے لیے کام کرنے کا کوئی پروگرام خود ہی بنا لیا ہو۔ جو بھی ایمان لایا اُس نے آنحضور صلعم کو اپنا لیڈر اور مطاع مان کر خود آپ ہی سے ایمان لانے کے تقاضے معلوم کیے، آپ ہی سے خدا کی عبادت کا طریقہ دریافت کیا، آپ ہی سے اصلاح و تعمیر کا نقشہ مانگا، آپ ہی سے پروگرام لیا، آپ ہی کے سامنے مشکلات رکھیں، آپ ہی سے ہدایات اور مشورے لیے اور آپ ہی کے تحت ایک کڑے ڈسپلن کی پابندی اختیار کرلی۔

چنانچہ مکہ کی سرزمین سے جو نئی انقلابی پارٹی اپنی کونپل نکال رہی تھی، اس کے کوائف حسب ذیل تھے:

(۱) نظریۂ اساسی (PARTY CREED) توحید تھی، یعنی خدا کو لاشریک ماننا اور اس معنی میں لاشریک ماننا کہ سوائے اس کے نہ کوئی پوجا کرانے کا مستحق ہے نہ اطاعت کرانے کا!

(۲) اس کا نظام تربیت نماز پر مشتمل تھا۔

(۳) اس کا دعوتی پروگرام زیادہ تر خاموش انفرادی دعوت پر مشتمل تھا۔

(۴) اس کا سوشل پروگرام غریبوں اور بیکسوں کی دستگیری اور مظلوموں کی حمایت تھا۔

(۵) اس کی قیادت خدا کی طرف سے مامور شدہ کامل اور معصوم لیڈر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھی۔

یہی ننھی سی جماعت (PARTY) تھی جس کے نظام تربیت، جس کے دعوتی اور سوشل پروگرام میں آہستہ آہستہ وسعت آتی گئی اور ایک دن دنیا نے دیکھا کہ یہ ایک نئی قسم کے اسٹیٹ کے مرتبے تک جا پہنچی ہے۔

قرآن کا مطالبہ اہلِ ایمان سے "اعتصام بحبل اللہ" کا ہے یعنی خدا کے دین کی رسّی کو جس کا ایک سرا آنحضور صلعم کے ہاتھ میں تھمایا گیا تھا ــــ تھام کر وہ ایک منظم طاقت بنیں، وہ بھائی بھائی ہوں، وہ "بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ" کی شان پیدا کریں، وہ تفرقہ سے پرہیز کریں اور آخری مطلوب ان کے سامنے ایک ایسی "بنیانِ مرصوص" میں ڈھل جانے کا رکھا گیا جس کے ساتھ ٹکرانے والی ہر طاقت پاش پاش ہو کے رہ جائے۔ اسی مقصد کے لیے عبادات کا نظام بھی اجتماعی رکھا گیا اور

تاکید کی گئی کہ واركعوا مع الراكعين تنظیم جماعت ہی وہ اہم مطلوب تھا جس کے لیے آنحضور صلعم کو تاکید کی گئی کہ واخفض جناحك للمومنين یعنی آپ اہل ایمان کے لیے اپنے بازوؤں کو ٹھیک اس طرح شفقت سے جھکا دیں جس طرح مرغی اپنے چوزوں کو اپنے سایۂ حفاظت میں لینے کے لیے ان کو اپنے پروں میں لے لیتی ہے۔ اور پھر کمزور اہل ایمان کا تذکرہ کرتے ہوئے بطور تحسین اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ فبما نعمة من ربك لنت لهم (یہ جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کی ایک دین ہے کہ آپ ان کے لیے نرم خو ہوئے) ورنہ بصورت دیگر آپ اگر درشت مزاج اور غصہ ور ہوتے تو یہ لوگ آپ کے آس پاس سے چھٹ گئے ہوتے یعنی اہل ایمان کا رسول اللہ کے آس پاس سے چھٹ جانا اور فرد فرد ہو کر منتشر ہو جانا ایک نامطلوب حالت تھی جس کے بارے میں متنبہ کر دیا گیا، اور برعکس اس کے مطلوب حالت یہ تھی کہ وہ رسولؐ اللہ کے گرد مجتمع رہیں۔

اسکیم چونکہ دنیا بھر کی اخلاقی اصلاح و تعمیر کے لیے میدان میں ایک "امتِ وسط" کو لانے کی تھی، نقشہ چونکہ حزب الشیطان کے بالمقابل ایک حزب اللہ کو کھڑا کرنے کا تھا، اس لیے ناگزیر تھا کہ اوّل قدم ہی سے تنظیم کا اہتمام کیا جاتا تنظیم کی مہم کا انچارج اپنے دور میں خود رسولؐ ہی ہوتا ہے، اس کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ وہی مومنوں میں اعتصام بحبل اللہ پیدا کرتا ہے، وہی ان کو اخوت کے رشتے میں پروتا ہے، وہی ان میں باہمی ولا پیدا کرتا ہے، وہی ان کو حزب اللہ بناتا ہے، وہی ان کو امتِ وسط بنانے کا اہتمام کرتا ہے، وہی ان کے لیے اجتماعی عبادات کا نظم چلاتا ہے، وہی ان کو پروں تلے سمیٹتا ہے، وہی ان کو اپنے آس پاس جمع کر کے منتشر ہونے اور تفرقہ میں پڑنے سے بچاتا ہے اور وہی قیادت کی باگ ڈور تھام کر ان کو ایک بنیانِ مرصوص کے معیار تک لاتا ہے۔ حتیٰ کہ خدا کا دین اور رسولؐ کی دی ہوئی فکر جماعتی زندگی کے ذریعے اپنی اجتماعی شان کا پورا پورا مظاہرہ کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

لفظ "امت" ایک تنظیمی ہیئت کو پیش کرتا ہے۔ اسی طرح لفظ رفیق (شیعہ، صحابی، حواری) کا استعمال مختلف رسولوں اور انبیاء پر ایمان لانے والوں کے لیے قرآن میں جس طرح کیا گیا ہے وہ

ایک تنظیمی رابطہ کو بیان کرتا ہے۔ "ال" کا لفظ بھی مجازاً انبیاء کی امتوں کی داخلی وابستگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

یہ ناقابلِ تصور ہے کہ کوئی نبی آئے اور وہ مومنین کی جماعت بندی نہ کرے اور ان کو اپنی کمان میں منظم کرنے کا اہتمام نہ کرے۔ چنانچہ خود آنحضورؐ کی پیدا کردہ تنظیم کے لیئے "الجماعۃ" (THE PARTY) کی اصطلاح حدیث اور فقہ کے لٹریچر میں بڑی کثرت سے استعمال ہوئی ہے۔

جماعت بندی کا یہ عظیم الشان کام جب کوئی رسول کرتا ہے تو خدا کے حکم سے آزاد ہو کر محض بطورِ خود ایک کارِ زائد کے طور پر نہیں کرتا، بلکہ بہ حیثیت مامور کے کرتا ہے۔ یہ کام اسی طرح اس کی ذمہ داریوں میں داخل ہے جس طرح بلاغ کا ابتدائی کام اس کی ذمہ داریوں میں داخل ہے۔ وہ جماعت بندی کے اس کام میں بھی جن جن اصولوں اور طریقوں کو عمل میں لاتا ہے اور جو جو تلقین وہ کرتا ہے وہ سب خود دین کا ایک حصہ قرار پاتا ہے۔

تحریک

قرآن کے بھیجنے والے نے رسول اللہ پر جس جماعت کی تنظیم کا بار ڈالا تھا وہ کوئی معمولی قسم کی غیر سیاسی انجمن نہ تھی، وہ کوئی کلچرل ادارہ نہ تھا، وہ کوئی مذہبی گروہ بندی نہ تھی، بلکہ وہ نظامِ زندگی کو بدلنے کا پروگرام لے کر اٹھنے والی اصولی پارٹی (IDEALOGICAL PARTY) تھی۔ اس پارٹی کو رسولِ کو جس ذمہ داری کی سرانجام دہی کے لیے منظم کیا تھا وہ ان آیات میں وضاحت سے بیان کر دی گئی ہے:-

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ

وہی اللہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر اس لیے بھیجا ہے کہ وہ اُس کو ہر دوسرے دین کے مقابلے میں غالب کر دے۔

یعنی رسول اللہ دین کو صرف بیان PREACH کر دینے ہی پر مامور نہ تھے بلکہ اسے نظامِ زندگی کی حیثیت سے با اقتدار بنا دینے کا فریضہ بھی آپؐ کے کندھوں پر ڈالا گیا تھا۔ آپؐ کچھ

اصولوں کو نری نظری (ACADEMIC) بحثوں کے لیے لے کے تشریف نہیں لائے تھے بلکہ معاشرے میں ان کو عملاً نافذ کرنا بھی آپ کے ذمے تھا۔ آپ کی سرگرمیاں کچھ عقیدوں کو محض نہاں خانۂ دماغ کی زینت بنا دینے تک محدود نہ تھیں بلکہ ان عقیدوں کو ایک ریاست کی بنیاد بنا دکھانے کا مطالبہ بھی آپؐ سے تھا۔ آپ کا منصب نجی زندگی کے لیے چند اخلاقی نصیحتیں کرنے تک محدود نہیں تھا، بلکہ معاملہ ایک نظامِ سیاست و تمدن کو برپا کرنے کا درپیش تھا۔

مطلوب محض ایک دین کو مان لینا اور اس پر کاربند ہو جانا نہیں ہے، بلکہ تقاضا یہاں "اقیموا الدین" کا ہے۔ یہم درپیش صرف خدا کی کتاب کو پڑھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی نہیں ہے، بلکہ "اقامتِ کتاب" کی ہے۔ سوال حدود کو مان لینے اور ان کی پابندی اختیار کر لینے تک کا نہیں، بلکہ اقامتِ حدود" کا ہے۔ رسُل و انبیا کا فریضہ لوگوں کو تعلیمِ قسط دینے ہی کا نہیں، بلکہ "لیقوم الناس بالقسط" (لوگ کاربند ہو جائیں نظامِ قسط پر) کی حالت پیدا کر دینا ہے۔

پس رسولوں اور انبیاء کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک اجتماعی قوت پیدا کر کے معاشرہ کے نظام کی مکمل تبدیلی کے لیے ایک انقلابی تحریک چلائیں۔ خیالات کو خیالات سے، نظریات کو نظریات سے، مقاصد کو مقاصد سے ٹکرا دیں۔ حق اور باطل کے درمیان سوسائٹی نے جو سمجھوتے قائم کرائے ہوں اور غلط اور صحیح کے اجزا میں جو جوڑ لگا دیئے ہوں ان کو توڑ کر اضداد میں کھلا کھلا تصادم پیدا کر دیں۔ خبیث اور طیب چھٹ کر الگ ہو جائیں، کھوٹے اور کھرے میں علیحدگی ہو جائے، فساد اور صلاح میں منافات عملاً پیدا ہو جائے، بقذف اللّٰہ الحق علی الباطل (اللّٰہ حق کو باطل سے ٹکرا دیتا ہے) کا سماں سامنے ہو اور نتیجہ یہ نکلے کہ "واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض"۔ یعنی وہی اصول و نظام زمین پر قائم رہ جائے جو انسانیت کے لیے موجبِ فلاح ہو۔

ایک سوسائٹی جن غلط چیزوں پر کاربند ہو، ان کو صرف اپنے لیے ناپسند کرنے یا خود اختیار نہ کرنے تک کا قصہ ہوتا تو بات اور تھی، مگر یہاں تو سوسائٹی کی مضبوط اور قرنوں سے جمی ہوئی طاقت کے رُوبرو ہو کر غلط کو غلط کہنے، اس کے مقابلے میں زورِ استدلال اور زورِ اخلاص اور صبر و استقامت کے ساتھ حق

کو ہٹش کر دینے کا پروگرام تھا، اتنا ہی نہیں، بلکہ غلط کو اُٹھا کر ملیامیٹ کر دینے اور صحیح کو اس کی جگہ با اقتدار بنا دینے کا پروگرام تھا۔ ایک ماحول کے ماحول کو جو حرم کی طرح مقدس بنا دیا گیا تھا، توڑنا بھی پیش نظر تھا، اور اس کی جگہ ایک نئے ماحول کو استوار کر دینا بھی مطلوب تھا پس ناگزیر تھا کہ رسولؐ اپنی جماعت کے ذریعے ایک ہمہ گیر تحریک چلائے۔

تحریک کا لازمی تقاضا حاضر و موجود پر تنقید اور اس کے ہر ہر باطل جزو کے خلاف ذہنی جنگ ہے۔ اس کے نتیجے میں آزمائش (PERSECUTION) ناگزیر ہے۔ آزمائش کا سامنا کرتے ہوئے مقصد کی طرف بڑھنا بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ لوگوں میں اپنے اصول اور نصب العین سے وابستگی، اپنے دین پر ایمان، اور آپس میں اجتماعیت کا احساس اور جذبۂ ایثار زیادہ سے زیادہ کارفرما ہو۔ چنانچہ رسولؐ ان لوازم تحریک کا اہتمام کرنے کا ذمہ دار تھا۔ اس کا منصب قیادت قدم قدم پر اس کے لیے نئے مسائل پیدا کرتا تھا اور وہ ان مسائل کو اپنے نظریے کے دیے ہوئے اصولوں سے حل کرتا تھا۔ تحریک کی باقاعدہ پوری جنگی اسکیم (STRATEGY) ہوتی ہے اور رسولؐ مامور تھا اس پر کہ اس اسکیم کو ہدایت الٰہی کے تحت روبعمل لائے۔

تحریکیت کا یہی پہلو تھا، جس نے ہر دور میں ایمان لانے والوں کے لیے لازم کر دیا کہ وہ خدا کے رسولوں اور انبیاء پر ایمان ہی نہ لائیں اور پیروی ہی نہ کریں بلکہ ان کی حمایت بھی کریں۔ جیسے کہ بنی اسرائیل کے میثاق کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "انی معکم لئن . . . . وآمنتم برسلی وعزرتموھم" (میں تمہارے ساتھ ہوں گا، بشرطیکہ . . . . اور تم ایمان لاتے رہے میرے بھیجے ہوئے رسولوں پر اور ان کی حمایت کرتے رہے) یہاں رسولوں کے لیے صرف ایمان لانے ہی کا نہیں، بلکہ ان کی امداد اور حمایت کرنے کا مطالبہ بڑی صراحت سے کیا گیا ہے۔ حمایت اور امداد کاہے میں؟ اسی تحریکی جدوجہد میں جو وہ کسی نظام کفر و فسق کے خلاف کریں۔

خود آنحضور صلعم کے لیے یہی مطالبہ صاف لفظوں میں سامنے آتا ہے:۔

الذین یتبعون الرسول النبی الامی وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں امی رسول نبی کی . . . .

.... فالذین اٰمنوا بہ وعزروہ و نصروہ ..... الخ

تو جو لوگ اُس پر ایمان لائے، جنہوں نے اس کا ساتھ دیا اور جنہوں نے اس کی مدد کی ....

یہ ساتھ دینے اور مدد کرنے کا مطالبہ اُسی تحریک کے کام کے لیے ہے کہ جس میں اجتماعی قوت کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی دماغی، جسمانی، مالی اور دوسری مختلف قوتوں سے ایک قیادت کے تحت سمٹ کر جدوجہد کریں۔ اسی کام کے لیے حضرت عیسیٰؑ نے پکارا تھا کہ "من انصاری الی اللہ؟" اور جواب میں حواریوں نے کہا تھا کہ "نحن انصار اللہ"۔ پھر یہی پُکار دوبارہ قرآن کی طرف سے بلند کی گئی۔ یا ایھا الذین اٰمنوا کونوا انصار اللہ" (اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بنو)۔

اور ہاں یہی وہ تحریکی جدوجہد ہے جو ایک طرف اللہ اور رسول کی رضا کو رکھ کر اور دوسری طرف دنیوی مفاد کو آراستہ کر کے آزمائش میں ڈالتی ہے اور پھر چیلنج کرتی ہے کہ:-

اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَا اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ۔ (التوبہ-۳)

اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور جوڑے اور کنبے قبیلے کے لوگ اور اموال جن کو تم سینت سینت کر رکھتے ہو، اور کاروبار جس میں گھاٹا پڑنے سے ڈرتے ہو، اور اپنی اقامت گاہیں جن کو تم پسند کرتے ہو، تمہارے لیے اللہ اور اس کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد کرنے (کے فریضے) کے مقابلے میں زیادہ محبوب ہیں تو پھر انتظار کرو، تا آنکہ اللہ کوئی فیصلہ نافذ کردے۔

معلوم ہوا کہ کارِ دین میں کوئی ایسی مہم شامل تھی جس میں رشتے چھوٹتے تھے، دوستیاں ٹوٹتی تھیں، جوڑے بچھڑتے تھے، مال تباہ ہوتے تھے، تجارتیں چوپٹ ہوتی تھیں اور گھر اجڑتے تھے۔ اور اس ہمہ گیر آزمائش کے ہوتے ہوئے مطالبہ یہ تھا کہ خدا اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جدوجہد کرنے کے فریضے کو اتنا محبوب بناؤ کہ اس پر یہ سب کچھ قربان کردو۔ ورنہ پھر جو فیصلہ ہوگا، وہ ہوگا۔ اُس کا انتظار کرنا چاہو تو کرو!

یہی وہ زہرہ آب کر دینے والی سنگین مہم تھی جس کے سخت مراحل کے سامنے آنے پر صاف صاف کہا گیا کہ یہ نہ سمجھو کہ اللہ کی جنت مفت میں لٹ رہی ہے، (اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ) اور تمہیں جدوجہد اور آزمائش کی کٹھالی میں ڈالے بغیر، پہلے زمانے کے اہل ایمان کے مقابلے میں کوئی خاص رعایت برتتے ہوئے ٹھنڈی سڑک سے گذار کر جنت میں پہنچا دیا جائے گا - ایسا نہیں ہوگا، بلکہ باساء وضراء کے مراحل سے گذرنا پڑے گا جن میں تم تڑپ تڑپ کر اللہ کی مدد طلب کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے، اور یہی وہ موقعہ ہوگا کہ اللہ کی مدد نازل ہوگی۔

مختصر یہ کہ رسول کی براہِ راست ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری غلبۂ دین کے لیے عمومی تحریک چلانے کی ذمہ داری ہے۔ وہ اس تحریک کے لیے اللہ کی ہدایت کے مطابق منصوبہ بندی کرتا ہے، اسے مختلف مراحل میں سے ایک خاص طریقے سے گذارتا ہے، اس کے مسائل کو اپنے اصولوں سے حل کرتا ہے، مخالفین کی سازشوں اور حملوں سے اس کو بچانے کی مختلف تدابیر اختیار کرتا ہے اور اسے اس کے صحیح فطری ارتقاء پر چلنے کے لیے توسیع کے ساتھ ساتھ استحکام کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ رسول کا یہ کام نہ غیر دینی کام ہوتا ہے، نہ غیر قرآنی۔ وہ تحریک کی قیادت کرنے اور تحریک کو آگے بڑھانے میں جو اصول اور طریقے استعمال کرتا ہے وہ سب عین دین قرار پاتے ہیں اس مہم میں نبی بہ حیثیت ماموریہ کے کام کرتا ہے اور اس کام کو کرنے کے لیے وہ باقاعدہ اللہ کی طرف سے منصب اور اتھارٹی رکھتا ہے اس وجہ سے بعد کے لوگوں میں سے جس کسی کو بھی اسلامی تحریک چلانے کی سعادت نصیب ہوتی ہے، وہ رسولؐ کے تحریکی اصولوں اور اس کے مخصوص کیے ہوئے طور طریقوں کو اختیار کرنے اور ان کی پابندی میں چلنے کا شرعًا مکلف ہے۔ رسولؐ کے اختیار کردہ اصولوں اور مخصوص طریقوں کو منسوخ کرنے کا، اور ان کی جگہ کوئی سے من مانے اصول اور طریقے لینے کا کسی دوسرے کو اختیار نہیں ہے۔

اسلامی ریاست کی تاسیس ——

خدا کے رسول اپنی انقلابی تحریک کے ذریعے حالات پر جونہی قابو حاصل کر لیتے ہیں تو پھر ان کی

ذمہ داری میں یہ بات بھی داخل ہو جاتی ہے کہ وہ باقاعدہ اسلامی ریاست کی تاسیس کریں، اسلامی حکومت کو خود اپنی امامت و امارت کے تحت قائم کریں۔ غلبۂ دین کی یہی صورت ایک مکمل صورت ہے کہ خدا کے دین کا قانون چلے، خدا کے دین کی تعلیم دی جائے، خدا کا دین معاشرتی اور معاشی مسائل پر حکمراں ہو، اور خدا کا دین صلح و جنگ کے معاملات کو طے کرنے پر قادر ہو۔ "کلمۃ اللہ" صرف ایک نظام ریاست ہی کی صورت میں "علیا" ہو سکتا ہے۔ جدوجہد کا تقاضا جس مقصود کے لیے ہے وہ ولاتکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ! یعنی کسی فرد بشر کے لیے خدا کی بندگی و اطاعت کرنے میں رکاوٹ بننے والی مزاحم ہونے والی اور خلل پیدا کرنے والی ہر طاقت کا زور ٹوٹ جائے۔ وہ ترغیبات و موانعات باقی نہ رہیں جو ایک ناسازگار ماحول میں موجود ہوتی ہیں، کسی کا اختیار ایسا نہ رہے کہ دین کے کسی جز کی پیروی میں مخل ہو۔ بلکہ اس کے بخلاف وہ ساری سہولتیں، وہ سارے انتظامات، وہ سارا تحفظ، وہ سارا نظام تربیت اور دین سے انحراف کو روکنے کے لیے وہ سارا سوشل دباؤ اور قانونی زور بہم پہنچ جائے جس کے ہوتے ہوئے دین پر چلنا آسان اور اس کی مخالفت مشکل ہو جائے۔ ہر طرف اللہ ہی کا دین جلوہ گر ہو، پورا ماحول اس کے زیر اثر ہو، اور کسی شعبۂ زندگی میں کسی دوسرے دین ـــ نظام زندگی ـــ کا اقتدار باقی نہ رہے۔

قرآن چاہتا ہے کہ سمع وطاعت کے ایسے نظم میں انسانی معاشرہ ڈھل جائے جس میں اصل اطاعت خدا کی اطاعت ہو، خدا کی اطاعت کرنے کے لیے رسول کی کامل اطاعت کی جائے اور اس سے نچلے درجے پر جو لوگ خدا و رسول کی اطاعت میں نظام زندگی کو چلانے والے ہوں ان کی اطاعت "معروف" کی حد تک کی جائے۔ اطاعت کی ان تین کڑیوں میں سے اگر کوئی ایک بھی ٹوٹتی ہو، یا کوئی چوتھی کڑی ساتھ آ شامل ہوتی ہے تو پھر نظام سمع وطاعت جو بھی ہوگا قرآنی نظام نہیں ہو سکتا۔ ظاہر بات ہے کہ جب تک سیاست و تمدن کی مشینری پر خدا کے دین کے سوا کوئی اور طاقت قابض ہوگی اس کے سائے میں تو دینی نظام سمع وطاعت چلنے سے رہا، کیونکہ دو مختلف نظام متوازی طور پر نہیں چل سکتے۔ پس دینی نظام سمع وطاعت کے معیاری حد تک قائم ہو جانے ہی کا نام اسلامی ریاست ہے، اور اس

کے قیام کی سعی و کاوش پورے کے پورے دین کا مرکزی تقاضا ہے۔ اس تقاضے کو روبہ عمل لانے کے لیے سب سے زیادہ ذمہ داری رسول ہی کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ آنحضور صلعم اپنے اس فریضے کے بارے میں اتنے باخبر (CONSCIOUS) تھے کہ آپ کو مکّی دَور ہی میں اپنے کام کا مستقبل صاف نظر آرہا تھا۔ "بیعتِ عقبہ" میں بات جس طرح انصارِ مدینہ کے ساتھ طے ہوئی تھی وہ ایک نمایاں شہادت ہے اس بات کی کہ آنحضور اسلامی ریاست کو قائم (ESTABLISH) کرنے کی ذمہ داری کا بارِ خوب اچھی طرح محسوس فرماتے تھے۔ چنانچہ جونہی مدینہ میں منتقل ہو کر آپ نے پہلا موقع پایا تو ایک منٹ ضائع کیے بغیر اپنی امارت میں اسلامی ریاست کی بنیادیں رکھ دیں۔ اس کے لیے انصار کے قبائل اور یہودیوں کو چند دستوری بنیادوں پر ایک تحریری معاہدے اور اعلامیے کے ذریعے متفق کیا، جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت (SOVEREIGNTY) اور اپنی امارت اور فائنل اتھارٹی کو بنیادی حیثیت سے تسلیم کرایا۔ پھر آس پاس کے قبائل سے حلیفانہ معاہدات استوار کیے، پھر اس ننھّی سی ریاست کو جو ابتداءً ایک شہری ریاست (SITY STATE) کی حیثیت سے رونما ہوئی تھی۔ مخالف طاقتوں کی سازشوں اور ان کے حملوں سے بچانے کے لیے ایک پاکیزہ اسلامی حکمتِ عملی کو اختیار دیا۔ دشمن عناصر کو کمزور کرنے اور ان کی توجہ تقسیم کر دینے اور ان کی طاقت کے ٹکڑے کرنے کے لیے اخلاقی حدود کی شدید پابندی کے ساتھ معقول صورتیں اختیار کیں۔ اس طرح آپ کا وہ سیاسی کارنامہ وجود میں آیا جس سے ایک دنیا کو فیض پہنچا۔ اس کارنامے کا ہر جزء دین ہی دین ہے، کچھ اور نہیں!

یہ کارنامہ آپ نے خدا کی رضا سے آزاد ہو کر یا قرآن کے مطالبات سے آگے بڑھ کر محض بطور نفل نہیں سرانجام دیا بلکہ خود خدا کی مرضی کو پورا کرنے اور قرآن کے ایک ایک شوشے کو عملاً قائم کر دینے کے لیے انجام دیا۔ اس پورے کام میں آپ اسی طرح مامور من اللہ تھے، اسی طرح رسول تھے، اسی طرح اتھارٹی اور سند تھے جس طرح بلاغ کے کام میں تھے اور تبیینِ کتاب — تلاوتِ آیات، تعلیمِ کتاب، تعلیمِ حکمت اور تزکیہ — کی مختلف ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں تھے۔ بلاغ ابتدا تھی تو

اقامتِ دین انتہا! وہ ابتدا اس انتہا کے لیے ضروری تھی!

اسٹیٹ کے قیام ہی سے آپؐ "لتحکم بین الناس بما اراک اللّٰہ" کا مقصودِ رسالت پورا کرنے کے قابل ہوئے، اور یہ مقصود آپؐ کے منصب میں قرآن نے شامل رکھا ہے۔ رسول اللہ صلعم صرف بلاغ کے لیے نہیں آئے تھے، بلکہ لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے اور حکم دینے آئے تھے فیصلے بھی صرف کلامی طور پر نظریات و عقائد کے اختلافات کے کرنے مطلوب آخری نہیں تھے، بلکہ زندگی کے سارے ہی معاملات کو عدالت کی با اختیار کرسی سے چکانے کا سوال تھا۔ اس با اختیار کرسی پر آنحضور کو اللہ تعالیٰ اُن حدود کی اقامت کے لیے اور اُن قوانین کے نفاذ کے لیے بٹھانا چاہتا تھا جن کے مجموعے کا نام شریعت ہے۔ چنانچہ اسلامی نظامِ عدالت کی سب سے اونچی کرسی پر بیٹھ کر آپؐ نے جو جو اصولی قانون جس جس تفصیلی شکل میں مختلف معاملات پر منطبق کر دیئے ہیں اور جتنے نظائر اپنے پیچھے چھوڑے ہیں اور منصبِ قضا کے حقوق و فرائض کو جس شکل میں مقرر کر دیا وہ تمام امت کے لیے اپنے اندر دینی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

اسی طرح اسلامی اسٹیٹ کے تحفظ و بقا کے لیے اور اس کے فطری پھیلاؤ کا راستہ صاف کرنے کے لیے اور اس کے اصولوں کو فروغ دینے کے لیے جہاد کرنا بھی رسول کے فرائضِ منصبی میں داخل تھا۔ آپؐ خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے امیرِ جہاد اور سپہ سالار تھے۔ آپ نے میدانِ جنگ کے لیے جو اصول اور طریقے اختیار کیے ہیں اور جنگی پالیسی کے لیے جو فارمولے تیار کیے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے واجب الاتباع ہیں۔ کیونکہ آپؐ اس پہلو سے بھی اتھارٹی اور سند ہیں۔

الغرض آپ کی بڑی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمّہ داری "اقامتِ صلوٰۃ" کی ذمہ داری تھی۔ اس مقصد کے لیے آپؐ خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ امام تھے۔ اور امامِ صلوٰۃ کیا، آپ امیرِ حج بھی تھے، آپ محافظِ بیت المال بھی تھے، آپؐ اصل محصّل زکوٰۃ بھی تھے — یعنی ساری عبادات کا نظم آپ کے ہاتھوں میں تھا۔ ذمّہ داری کے اس جزء کی ادائی میں بھی آپ کے اختیار کردہ اصول اور طریقے ہمیشہ کے لیے ماخذِ ہدایت قرار پاتے ہیں۔

ہم نے ان ساری ذمہ داریوں کو اسلامی ریاست کی تاسیس کی جامع ذمہ داری کے تحت جمع کر دیا ہے۔ یہ درحقیقت ریاست ہی کے عملی شعبے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی ذمہ داری اولاً رسولؐ پر عاید ہوتی ہے، ثانیاً باقی امت پر!

کیا یہ ساری ذمہ داریاں جن کا اجمالاً ہم نے تذکرہ کیا ہے، خود قرآن ہی سے ثابت نہیں کہ ان کا بار حضور صلعم کے کندھوں پر براہِ راست اللہ تعالیٰ نے ڈالا تھا؟ جب یہ ثابت ہے تو پھر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ رسول اللہ کی ذمہ داریوں کو لفظ "بلاغ" تک محدود قرار دے کر آپؐ کو (نعوذ باللہ) ایک قاصدِ محض بنا دینے کی کوشش کرے۔ قاصد کا کام پارٹی منظم کرنا نہیں ہو سکتا؛ قاصد پر تحریک چلانے کی ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی؛ قاصد کو ایک ریاست کا معمار نہیں بنایا جا سکتا؛ قاصد سے قضاء اور اقامتِ حدود اور امارتِ جہاد، اور امامتِ صلوٰۃ کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کوئی بڑا عجیب قاصد ہو گا جسے مالک ایک پرچہ پہنچانے کے لیے اپنی رعیت میں بھیجے اور وہ وہاں آکر پارٹی منظم کرنے لگے، انقلابی تحریک چلانے میں لگ جائے، حکومت جمائے، عدالت کی کرسی پر براجے اور علمِ جہاد اٹھا کے میدان میں آجائے۔ کیا رسول اللہؐ نے نعوذ باللہ خدا تعالیٰ سے سرکشی کر کے یہ کام اپنی خواہش سے کر ڈالے تھے اور ان کاموں کے لیے ماموریت نہیں تھی؟ یا فی الواقع آپؐ کا منصب تھا ہی اتنا وسیع اور عظیم کہ اس میں بلاغ سے لے کر جہاد تک کی ساری ذمہ داریاں شامل تھیں؟ اگر یہ ذمہ داریاں عینِ منصبِ رسالت میں شامل تھیں تو پھر بلاغ کے دائرے سے آگے جو کچھ کارنامے آپ نے سرانجام دیئے ہیں، کیوں نہیں مانتے کہ ان سارے دائروں میں آپ خدا کے رسول اور مامور کی حیثیت سے ایک اتھارٹی اور سند بن کر کام کر رہے تھے؟ پھر کیوں نہیں تسلیم کرتے کہ آپ کے تمام کارناموں کا ایک ایک جزءِ دین و شریعت ہے اور واجب الاتباع؟ پھر کیوں نہیں اس حقیقت کے آگے سرِ اعتراف جھکاتے کہ ان کارناموں کا جو مستند ریکارڈ ہمیں ملتا ہے وہ عین سرچشمہ ہدایت ہے؟

(باقی آئندہ)